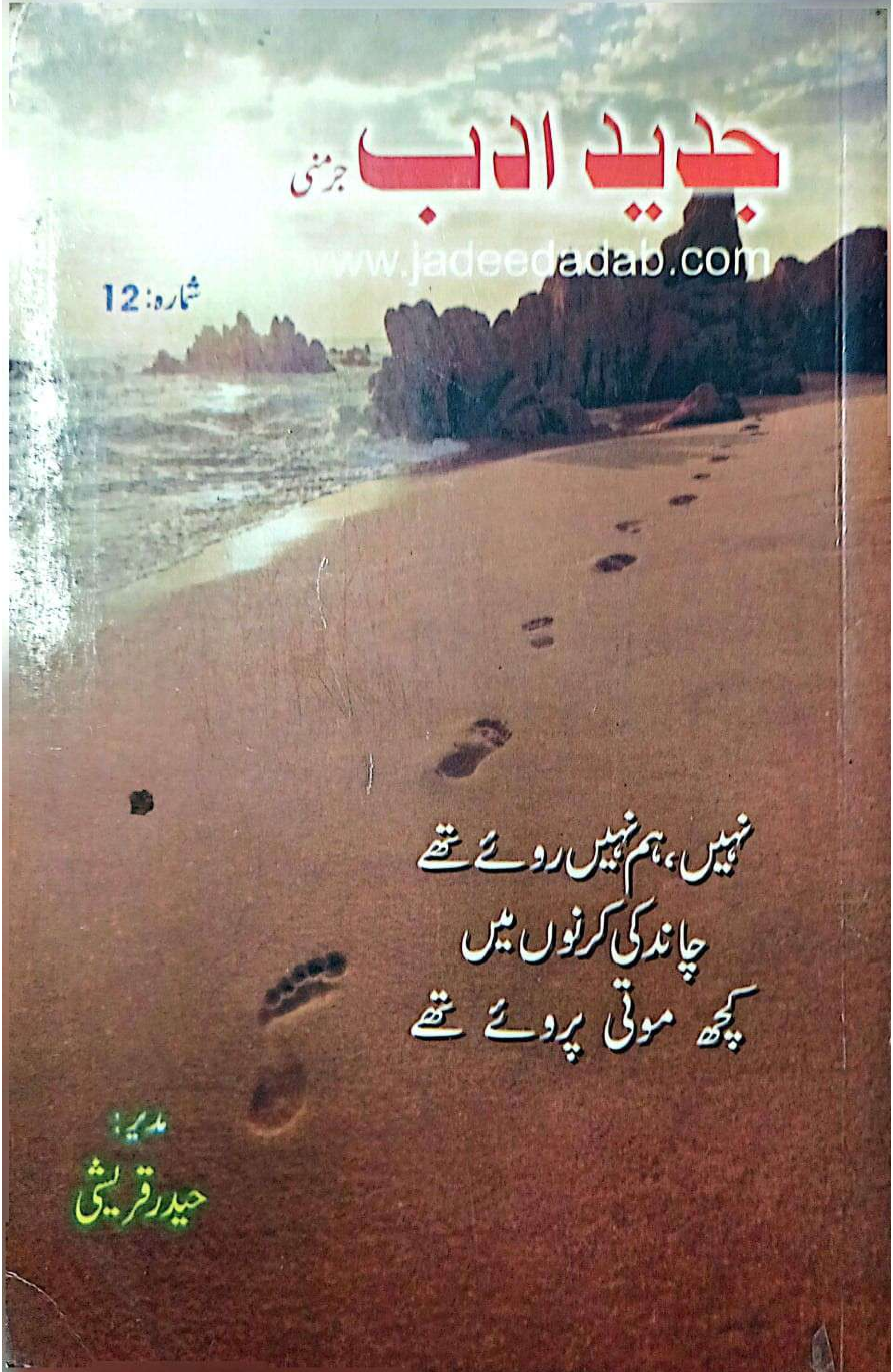


جدید ادب جرمنی

www.jadeedadab.com

شمارہ: 12

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

مدیر:
حیدر قریشی

کوائف احمد حسین مجاہد

نام: احمد حسین مجاہد

تاریخِ پیدائش: ۲/ مارچ ۱۹۶۱ء **جائے پیدائش:** بالاکوٹ۔ ہزارہ (پاکستان)

تعلیم: بی ایس سی (آنرز)۔ زراعت **ملازمت:** AVP زرعی ترقیاتی بنک لمیٹڈ

تصانیف

(۱) **دُھند میں لپٹا جنگل** (شعری مجموعہ۔ ۱۹۹۷) (۲) **سیف الملوک** (داستان۔ ۱۹۹۹)

(۳) **صفحۂ خاک** (آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ کے زلزلے کے حوالے سے۔ ۲۰۰۷)

(۴) **اوک میں آگ** (زیرِ ترتیب شعری مجموعہ)

پوسٹل ایڈریس

ماڈرن ایج پبلک اسکول اینڈ کالج۔ مانسہرہ روڈ۔ سپلائی۔ ایبٹ آباد۔ پاکستان

ای میل: mashiats@yahoo.com

ٹیلی فون: Tel(Res) 0092-992-502654 Mobile: 0092-345-9461234

☆ سرزمین ہزارہ نے دورِ حاضر میں اردو شعر و ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔ قتیل شفائی، محمد ارشاد، آصف ثاقب اور سلطان سکون کی اس نگری میں متعدد نوجوان شعراُ و ادبا خوبصورت تخلیقات مسلسل پیش کر رہے ہیں۔ احمد حسین مجاہد انہی تخلیق کاروں میں سے ایک نمایاں اور سر برآوردہ نام ہے۔ ''دھند میں لپٹا جنگل'' ان کی غزلوں اور نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن شعری تخلیقات کے عقب میں ایک جیتا جاگتا باشعور ذہن، ایک نہایت درجہ حساس دل اور امکانات سے چھلکتا ہُوا ایک وجدان کارفرما ہے۔ مجاہد کا یہ پہلا مجموعہ کلام ہے مگر یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُن کا بھرپور مستقبل پوری آن بان سے جھلکتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ شاعری کی دونوں اصناف۔۔۔ غزل اور نظم پر استادانہ حد تک حاوی ہیں اور اُن کے ساتھ آنے والے دور کی بہت سی توقعات وابستہ کرتے ہُوئے اہلِ ذوق کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہُو سکتی۔

احمد ندیم قاسمی

پروفیسر ضیاء المصطفیٰ ترک (ہری پور)

احمد حسین مجاہد

جو اپنے کناروں سے باہر بھی موجود ہے

کس کو معلوم تھا
کس نے سوچا تھا
اتنے سرابوں سے ہو کر گزرتے ہوئے
ایک دریا بھی رستے میں
آجائے گا
ایک دریا۔۔۔!
جو اپنے کناروں سے باہر بھی موجود ہے

یہ ایک نظم "دریا" کی سطریں ہیں جو اپنے معنوی و فنی تناظر میں فکری و تخلیقی توانائی کی واضح نشاندہی کر رہی ہیں۔ کارِ شعر گوئی بظاہر نہایت سادہ عمل معلوم ہوتا ہے کہ جو چاہا لکھ ڈالا اور جو جی میں آیا تحریر کر دیا لیکن درحقیقت ، یہ اپنے بطون میں نہایت پیچیدگی اور پُر اسراریت کا حامل ہے۔ ایک سادہ سا مصرعہ بھی بڑی دیدہ سوزی اور جانکنی کے مراحل کے بعد معرضِ اظہار میں آتا ہے، اور بالخصوص تازہ گو شعراء میں جو نیا پن اور جدّت نظر آتی ہے وہ تخلیقی ریاضت کے بغیر کسی صورت ممکن نہیں۔ اپنی لفظیات سے لیکر فکری جہات تک ایک خیال نہ جانے کس کس پیرائے اور اُسلوب میں منتقل ہوتا ہوا، اپنی مطلوبہ ہیئت اور شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ تخلیق کار ، اپنے انہماک میں ناموجود کو موجود میں بدلنے کی سعی میں نہ جانے کتنے ہفت خواں سر کرتا ہے، تب کہیں جا کر کوئی بھرپور اور توانا فن پارہ وجود میں آتا ہے، اور یہی دراصل معجزہ فن کی نمود کا عمل ہے

اُس کی تصویر سے مخاطب ہوں ۔۔۔ کیا خبر کوئی معجزہ ہو جائے!!

"احمد حسین مجاہد" کا مندرجہ بالا شعر اور نظم، میرے خیال میں اُس تصورِ شعر کی مکمل عکاسی کرتے ہیں جو اُس کے تخلیقی سفر کا محرک ہے۔ اُس کے کلام میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کے ایک دوسرے سے آمیز

ہونے سے تازہ اور توانا شاعری وجود میں آتی ہے۔ وہ اپنی فکری نہج اور اسلوب کی نوعیت کے اعتبار سے اُن صاحب طرز شعراء کے قبیلے سے مماثلت و مشابہت کا حامل ہے، جو ساٹھ ستر کی دہائی میں اور ازاں بعد منظر عام پر آئے اور شاعری میں تازہ کاری کو بار دیگر رواج دینے کا موجب ہوئے۔ اُس کی شعری زبان (Diction) اور مخصوص تمثال کاری (Imagery) جہاں اُس کے بعض ہمعصر شعرا کے ساتھ اُس کی فکری و تخلیقی قُربت کی نشاندہی کرتی ہے وہیں اُس کے شعری فضا، بجائے خود اُس کی ذاتی انفرادیت کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے معروف مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت (Tradition & Individual Talent)" میں ایک جگہ نقدِ شعر کے منصب کو واضح کرتے ہوئے بڑی خوبصورت بات کی، کہتا ہے: Honest criticism and sensitive appreciation is directed, not upon the poet but upon the poetry.

سو میرے خیال میں "احمد حسین مجاہد" کی شاعری فکری حوالے سے، ایسے آشوب کا بیانیہ ہے جو انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ بتدریج اجتماعی حیثیت میں نمو پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ اُس کے شعری دائرے میں ذرا تیوالی مخاطبت اور گاہے گاہے کی بلند آہنگی کہیں اُس تعزیتی سکوت کا اظہار یہ معلوم ہوتی ہے، جو اُس کے درون میں نہ جانے کب سے برپا ہے۔

مجھ کو میرے سب شہیدوں کے تقدس کی قسم ایک طعنہ ہے مجھے شانوں پہ سَر رکھا ہُوا !!!

ہم اور آپ تو ہیں دشتِ نینوا میں ابھی کہ خیمہ زن ہے عدو ارضِ انبیا میں ابھی

شعر میں تمثال کاری اور منظر نگاری کا عمل، جہاں شاعر کی فنی مہارت کی دلیل ہے وہیں اِس سے وہ فکری رُجحانات بھی اظہار پاتے ہیں جو تخلیقی سطح پر اُس کے تحرک کے لیے اُس کے نہاں خانوں میں کہیں اُمید اور یاسیت کے احساسات کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے امیجز میں زندگی ایک یقین کے ساتھ موجود ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ اُس کے اشعار درونِ ذات ایک شادمانی اور فرحت و مسرّت کے اجراء کا موجب بنتے ہیں۔ اِس ضمن میں چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:

برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چاند اترا ہے مجھے یہ وقت دعا کا دکھائی دیتا ہے

جھٹک کر ڈالتی ہے جب وہ بھیگے بال شانے پر تو نیچے دُور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے

میں کسی گم شدہ دریا پہ کھڑا ہوں احمد موج ورنہ مرے سر تک کوئی آئی ہوتی

مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اُس نے میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہُوا تھا

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ احمد حسین مجاہد کے ہاں بعض اوقات یہ تصویر کشی، بتدریج تجرید کاری کے ارتفاع پر منتج ہونے لگتی ہے، جس کی مثالیں اگر چہ فی الوقت بہت زیادہ نہیں لیکن یہ امر میرے لیے تو بہر حال نہایت خوش کُن اور لائقِ مسرّت ہے، کیونکہ میری دانست میں یہ وہ تخلیقی سطح ہے جو منتہائے سخن اور کمالِ شعر کہلائی

جا سکتی ہے، بشرطیکہ اس میں لایعنیت (Absurdity) شامل نہ ہو پائے۔ اوران دو اشعار پر نظر ڈالیے:

مکڑی پہ چمکی ہوئی قیس بوندیں کمرے میں کوئی معاملہ تھا

مثلِ سراب کرتی ہے موہوم سے ظہور جلتے ہوئے درخت کا سایہ ہے زندگی

بقول شخصے: "فن پارہ، کوئی الہامی شے نہیں ہوا کرتا جو کسی خاص لمحے اور مخصوص ہیئت میں از خود وجود میں آجائے، بلکہ فن پارے کو تو بہت سوچ سمجھ کر، بڑے سلیقے اور محنت سے تشکیل دیا جاتا ہے تاکہ وہ متعینہ مخصوص تاثر پیدا ہو جائے جو تخلیق کار نے پہلے سے طے کیا ہوا ہے اور یہ کام تلازمات (Correlatives) کی توضیح اور موزوں لفظیات (Diction) کے انتخاب سے ممکن ہو پاتا ہے"۔ اگر مذکورہ بالا نظریہ فکر کی روشنی میں "احمد حسین مجاہد" کی شاعری کو پڑھا جائے تو یہ تسلیم کیے بناہ چارہ نہیں کہ وہ لفظ و خیال کی ندرت اور تلازمہ کاری سے، شعر میں مطلوبہ تاثیر پیدا کرنے میں بجا طور پر کامیاب رہا ہے۔ اُس کی نظمیں اپنی کیفیت اور مزاج کے اعتبار سے، اُس کی غزلوں سے قدرے مختلف نظر آتی ہیں اور شاید اِس کی وجہ کسی حد تک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نظم کہتے ہوئے، شاید وہ نادانستہ طور پر داستان گوئی کی سمت منقلب ہو جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ اِس امتیاز کے باوجود، میرے خیال میں اُس کی نظمیں اپنے آہنگ کے لحاظ سے اُس کے فطری لحن میں صورت پزیر ہوتی ہیں اور یہ امر بجائے خود لائقِ تحسین ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بڑھتی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا

بہت بھلی تھی وہ شاخوں سے پھوٹتی ہوئی لَو شجر کی اوٹ میں شاید کوئی ستارا تھا

تجھ حسن سے معاملہ کس آن میں ہُوا میں تو جواں ہی میر کے دیوان میں ہُوا

جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں

احمد حسین مجاہد جس سرزمین پر محوِ سفر ہے، وہاں اِن دنوں جیتے جاگتے دریاؤں کے غیاب اور گم شدگی پر کوئی اچنبھا نہیں ہوتا۔ اُسے ٹوٹتے ستاروں نے آتے والے شدید موسموں کی پیش آگاہی بخشی ہے اور ہجرت و ہجر کے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ اپنی خاک ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ موجۂ خوشبو کے تعاقب میں سرگرداں ہے اور اپنی سانسوں کے ساتھ گردشِ افلاک میں شراکت کا دعویدار بھی۔ چار سُو بکھری آیات کی تلاوت کرتا ہُوا، اپنی تنہائی کے ہمراہ اَن دیکھی، انجانی سمتوں میں گامزن ہے۔ اُن سمتوں کی طرف جہاں ہر شجر کی اوٹ میں کوئی ستارا اپنی لَو کے جلو میں اُس کا منتظر ہے اور ہر کنجِ تاریک میں کوئی نقشِ کفِ پا، مثلِ چراغ روشن ہے۔ منہدم مکانوں پر نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد، اب اُس اب اُس کو طلب فقط آبِ حیات ہی کی نہیں بلکہ وہ بعد ازاں اوک میں بھری آگ کا گھونٹ بھرنے کو بھی تیار ہے۔ غبار آلود راستوں، ملبے تلے دبے پھولوں اور دلوں کو چیرتے بے نُور سناٹے سے گزر کر آنے والے کی سچائی لفظ لفظ آپ تک رسا ہونے کو ہے، خبردار رہیے گا!!

محمد اظہار الحق (اسلام آباد)

صفحۂ خاک

''ہم لڑکیوں کے ہائر سیکنڈری سکول کے قریب سے گزرتے ہیں۔ سکول میں ہر طرف بچیوں کے کھلے ہوئے بستے اور جوتے ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ ہَوا کو جانے کس ادھوری تحریر کی تلاش ہے کہ وُہ کتابوں اور کاپیوں کے صفحے الٹ رہی ہے۔ میں اِس منظر کی تاب نہیں لا سکتا''

یہ دلگداز اقتباس خوبصورت شاعری کرنے والے احمد حسین مجاہد کی تصنیف ''صفحۂ خاک'' سے ہے۔ آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ کی صبح برپا ہونے والے زلزلے نے کتی ہی بستیاں اجاڑ کر رکھ دیں، کتنے ہی قصبے زمین کے سینے سے اٹھا کر زمین کے پیٹ میں ڈال دیے اور کتنے ہی قریے ملبے کے ڈھیر میں بدل کر رکھ دیے لیکن جو رات بالاکوٹ پر گزری وُہ سب سے زیادہ تاریک تھی۔ اِس تیرہ بختی میں بالاکوٹ کو ایک خوش نصیبی میسر آ گئی (مجھے نہیں معلوم کہ خوش نصیبی کا لفظ یہاں برمحل ہے یا نامناسب ہے) اور وُہ یہ کہ احمد حسین مجاہد بالاکوٹ کا بیٹا تھا، اُس نے اپنے تباہ شدہ شہر پر نوحہ خوانی کرنے کے لیے درختوں کی سوختہ شاخوں سے قلم بنائے، راکھ کے ڈھیروں کو صفحوں میں تبدیل کیا اور اپنی خونی خونی انگلیوں سے ایسی کتاب لکھی جس کا ہر صفحہ اور ہر صفحے کی ہر سطر، اور ہر سطر کا ہر لفظ اور ہر لفظ کا ہر حرف اپنی جگہ مکمل نوحہ ہے، مکمل شہر آشوب ہے اور مکمل عزاداری ہے۔ لگتا ہے ''انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا'' والا مصرع کہا ہی احمد حسین مجاہد کے لیے گیا تھا۔

''صفحۂ خاک'' میں احمد حسین مجاہد نے ماتم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مجھے یہ کتاب پڑھتے ہوئے بارہا یوں لگا جیسے مجاہد نے اپنے بال نوچ کر بکھیرے ہُوئے ہیں، جیسے اُس نے پٹکا سر سے اتار کر کمر سے باندھا ہُوا ہے، جیسے وُہ سینے پر دوہتھڑ مار رہا ہے، جیسے وُہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بلک بلک کر رو رہا ہے، سسکیاں بھر رہا ہے، جیسے وُہ دونوں ہاتھوں کی انگشت ہائے شہادت اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُس کی کتاب کے ہر صفحے پر ملبہ ہے اور لاشیں ہیں، زخمی ہیں اور اُن کا واویلا ہے، بچے ہیں اور اُن کے ٹوٹے ہُوئے کھلونے ہیں، پرندے ہیں اور اُن کے جلے ہُوئے پر ہیں، مائیں ہیں اور اُن کے جگر گوشوں کی میتیں ہیں، باپ ہیں اور اُن کے نوجوان بیٹوں کے کفن ہیں، بھائی ہیں اور اُن کی بہنوں کے جہیز سے اٹھتا ہُوا دُھواں ہے اور بہنیں ہیں اور اُن کے بھائیوں کی اجتماعی قبریں ہیں۔

کون سنتا گمشدہ آواز میری — جا چکے سب ساتھی پیچھے رہ گیا ہوں

ریزگی بستی سے اجڑے ہوئے پنچھیوں کی — میں کسی ملبے کے پیچھے رہ گیا ہوں

درد اور دکھ کی شدت ملاحظہ کریں۔

"مجھے اکتوبر کو وہ دن یاد ہے کہ میں سو رہا تھا، زلزلہ آیا تو قریب ندی کے کنارے پر رہتا اس کا گھر مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور وہ دو دن ملبے کے نیچے دبا رہا۔ آخر کار ساتویں اکتوبر کی درمیانی رات ۔۔۔۔۔ وہ قیامت کی رات تھی زندگی اور موت کی کشمکش میں گزاری۔ بچنے والے بتاتے ہیں کہ ساری رات اس کی آواز آتی رہی بستی میں گونجتی رہی۔ وہ پکارتا رہا کہ میں زندہ ہوں مجھے ملبے سے نکالو۔ وہ ساری رات اور اگلا پورا دن … کے پہاڑ پر بھٹکتے اور رات بھر … ۔۔۔ کیا اس نے کس کس کو پکارا ہوگا کہ یہ … ہوگا جانے کس وقت اس نے آخری سانس لیا ہوگا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان اذیت ناک لمحوں میں اسے میرا بھی خیال آیا ہوگا۔۔۔ شاید اس نے مجھے بھی آواز دی ہو مجھے بھی پکارا ہو۔"

مجھے اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے سے بچوں کی ایک پوری نسل ختم ہو گئی۔ اس کی ذمہ داری تعمیرات پر ہے۔ ان درسگاہوں پر جو ستم کے تحت … عوام کا خون نچوڑنے کے لیے سرکاری عمارتیں غیر معیاری بناتے ہیں اور ستاتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد نے ان خوش گلو بچیوں کی مرثیہ خوانی کرتے وقت قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔ پڑھیے اور روئیے۔

"مٹی ملبے پر بکھری کتابیں اور کٹے ہوئے ہاتھوں سے جھانکتی کہنیاں کے درمیان تھرتھراتی … سے … کے حرف … درست … لگتی ہے۔۔۔"

احمد حسین مجاہد کی تصنیف "سکھ تک" اس تباہی کی داستان ہے جو زلزلہ والا … پورے کے آیا تھا یہ صرف داستان ہی نہیں اور بھی … ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک شاعر جب نثر لکھتا ہے تو نثر کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی رفعتوں پر لے جاتا ہے اس لیے کہ شاعری الہام ہے۔ آپ نثر لکھنا تو سیکھ سکتے ہیں شاعری کرنا نہیں سیکھ سکتے۔ دنیا میں آج تک کوئی مدرسہ، کوئی کالج، کوئی کتب، کوئی ادارہ ایسا نہیں گزرا جہاں شاعر کو شاعر بنایا جاتا ہو۔ جس کو تجزیہ اور تنقید کا اور وزن کا شعور نہ ہو وہ اس شعور سے بہرہ ور نہیں کیا جا سکتا۔ استاد "جواب مضمون" تو سکھا سکتا ہے "جواب شاعری" کی بھی کوئی کلاس نہیں ہوتی۔ چنانچہ شاعر جب نثر لکھتا ہے تو الہام کو شعر سے نثر تک منتقل کرتا ہے اور اسے مابعد الطبیعاتی (METAPHYSICAL) بنا دیتا ہے۔ آپ ادب کی دنیا میں نثر کے وہ شاہکار دیکھ لیں جو شاعروں نے چھوڑے ہیں۔ سعدی کی گلستان ہو یا کہ بوستان، غالب کے خطوط ہوں یا اقبال کی RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM ہو، شمس الرحمٰن فاروقی کا "سوار" ہو یا بورس پاسترناک کا ڈاکٹر ژواگو اور بے شمار دوسری کتابیں جو تصنیف کے اعلیٰ … پر مہر ثبت کر رہی ہے۔ احمد حسین مجاہد نے "سکھ تک" میں نثر اعلیٰ پائے کی لکھی ہے یہ ہو بہو اس کے شعر … کی

طرح ڈھکے ہیں۔ تباہی کے منظر نامے پر شعر آنسوؤں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے

پانی تھا میسر نہ کفن تھا نہ دعا تھی　　بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب　　اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

بالاکوٹ کے رہنے والے اس شاعر نے کئی سال پہلے پیشگوئی کردی تھی کہ

زیاں بجھتیوں میں ٹوٹتے ستاروں کی　　یہ شہر مجھ کو اجڑتا دکھائی دیتا ہے

مرگِ انبوہ کا ایک اور منظر دیکھیے

بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں رہی　　ہر لاش نے مکان کا ملبہ پہن لیا

مجاہد کا تنہا بیٹا اپنے مکان کے ملبے پر کھڑا ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے

بہت ہے فرشِ زمیں، بام و در نہیں نہ سہی　　یہ کائنات مرا گھر ہے، گھر نہیں نہ سہی

لیکن اس اندھیری رات میں روشنی بھی طلوع ہوئی اور وہ تھی اہل وطن کا اور دنیا بھر کے لوگوں کا فوری ردِ عمل۔ کراچی سے پشاور تک جس طرح پوری قوم اٹھی اور زلزلہ زدگان کی طرف چل پڑی، اس کی حالیہ تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ مجاہد لکھتا ہے۔

''میں نے ایک غریب عورت کو دیکھا جس نے شاید ساری زندگی کی جمع پونجی خرچ کر کے زخمی بچوں کے لیے چھوٹوں کے ڈبے خریدے تھے۔ وہ اپنا یہ اثاثہ لیے کیمپوں میں گھوم رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پھوٹتی کرنوں کی لو میں مجھے زندگی اتنی خوبصورت دکھائی دی کہ میں ایک لمحے کے لیے اپنے سارے دکھ بھول گیا۔''

مجاہد نے سب ملکی اور غیر ملکی تنظیموں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے کہ کس نے کیا کیا اور کتنا کیا۔ بالاکوٹ کو ایک اور جگہ بسانے کے منصوبے کا بھی مجاہد نے تفصیل سے تجزیہ کیا ہے لیکن شہر تاریخ، روایتوں اور وابستگیوں سے بنتے ہیں، نئی آبادیاں کالونی تو کہلا سکتی ہیں، شہر نہیں کہلا سکتیں۔ باقی صدیقی نے اسی لیے تو کہا تھا

زندگی حسنِ بام و در تو نہیں　　چند اینٹوں کا نام گھر تو نہیں

بالاکوٹ کے بام و در کا حسن وقت کے خرابے میں اتر کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور ''سخنِ خاک'' اس گمشدہ حسن کا نوحہ ہے۔

☆ ''دھند میں لپٹا جنگل'' پا کر مجھے اُس باپ جیسی خوشی نصیب ہوئی ہے جسے برسوں ترسنے کے بعد اولاد نصیب ہوئی ہو۔

قتیل شفائی

☆ تمہاری تازگی اور زبان پر کنٹرول نے متاثر کیا۔ تم میں ایک اچھے شاعر نے بسیرا کیا ہے، اس کا خیال رکھنا۔

ساقی فاروقی

جان عالم (مانسہرہ)

احمد حسین مجاہد کی شاعری اور ہمارے خواب

کرسٹوفر کاڈویل کہتا ہے کہ بندر کے لئے یا نیم وحشی انسان کے لئے گلاب کے ایک پھول کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک چمکتی سی چیز ہے، جسے کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعر کے لئے یہ کیٹس ،اینیکرون anacroon، حافظ، اوڈ، جیولز لیفور جیو jules Laforgue کا گلاب ہے۔ یہ کیفیت اس لئے ہے کہ آرٹ کی دنیا اجتماعی جذبے کی دنیا ہے، اُن الفاظ اور اُن علامتوں کی دنیا ہے جو تمام افراد کے تجربوں سے فراہم ہوتے ہیں اور اُس کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی سماجی زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کی مظہر ہے۔

وہ جذبات جن میں تمام افراد شریک ہوتے ہیں، معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ بدل جاتے ہیں ۔انسان فطرت کے آئینے میں اپنی آرزوئیں دیکھتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور انہیں اپنی انفرادی مجرد صلاحیتوں سے تجسیم دیتا ہے اور پھر معاشرے کے حساس لوگوں میں وہ خواب، وہ آرزوئیں بانٹ دیتا ہے۔ یوں ایک تخلیق کار اپنی ذات اور اپنی زندگی کے تجربات کو ایک معاشرے، ایک سماج کی اجتماعیت کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ خیالی دنیا جو حقیقت بدل سکتی ہے.... جو کسی طرح سے وجود میں نہیں آ سکتی، وہ شاعرانہ تقریب خیالی کی سطح پر بہت کچھ کر لیتی ہے...گوداموں کو غلے سے بھرتی ہے اور لہلہاتے کھیتوں کے سرور انگیز منظر دکھاتی ہے۔ اس کے بغیر وہ محنت امکان پذیر نہیں ہوتی جو اس کامیاب دنیا کو وجود بخشے۔

تو ہماری آرزوئیں، ہمارے خواب ہی ہماری زندگی کے رواں دواں رہنے کا اصل محرک ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ خواب دیکھنا ہی چھوڑ دے تو اس کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ اس اندیشے کو کوئی خواب دیکھنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کی دُور رس نظر اس اندیشے کو دیکھ رہی ہے؛

میں دیکھتا ہی نہیں خواب، میرا کیا ہوگا　　نظر میں رہتے ہیں اسباب، میرا کیا ہوگا

انسان کی زندگی میں اُس کے پاس اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں کہ وہ خواب دیکھتا ہے۔ آرزوئیں ،امیدیں جنم لیتی ہیں اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔ آج کے انسان نے جسے محرومی، مجبوری اور بے اختیاری کا نام دے اُسے خالق کا شاکی بنا دیا ہے، حقیقت میں خالق کا اپنی مخلوق پر سب سے بڑا احسان ہی یہی ہے۔ ہماری

زندگی کا سارا حسن ہمارے خواب ہیں۔ اور احمد حسین مجاہد تو زندگی اور موت کے پیمانے ہی الٹ دیتا ہے جب وہ زندگی کو خواب اور موت کو اس خواب سے بیدار ہونے کا نام دیتا ہے۔

جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی ۔۔۔ جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں

اگر جدت کا کوئی وجود ہے تو اس کی تعریف میں یوں کروں گا کہ آپ اُن علامتوں کو بدل دیں جو ماضی میں کسی خیال کے ساتھ چپک گئی ہیں۔ سمندر سیرابی کی علامت ہے تو اسے پیاس کے معنی دیں، صحرا پیاس کا اظہار ہے تو اسے سمندر کے معنی دیں۔ اگر علامتوں کے نئے نظام نہیں بنائے جا سکتے تو شاعری اپنے کلاسیکی دور میں زیادہ خوشنما مقام پر کھڑی ہے۔ پھر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت کا جواز نہیں رہتا۔ احمد حسین مجاہد نے مذکورہ بالا شعر میں جدت کے اس پیمانے پر پورا اترتے ہوئے نئی بات کی ہے۔ یہاں زندگی، خواب اور بیداری نئے معانی کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ اور خواب اپنی حقیقت اور اہمیت میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کی زندگی سے خواب کو الگ کرنا ہی اس کی موت بن جاتا ہے۔

خواب دیکھنے والا انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ عام انسان نہیں ہوتا۔ وہ حالات کی مشکلات سے ایسے گزر جاتا ہے کہ اُس کے راستے میں حائل شے اُس کے سامنے حائل نہیں ہو پاتی۔

لٹ گیا صف اعدا میں گھس کے نیارے میں ۔۔۔ وہ زعم تھا مجھے لشکر نظر نہیں آیا

یہی توانائی ہے جو ناممکنات سے ممکنات کے در کھولتی ہے، آسمانوں کو مسخر کرتی ہے اور زمین کے بطون سے اپنی تعبیریں نکال لاتی ہے۔ مجاہد کے ہاں اس توانائی کی ایک توانا شکل ملتی ہے؛

پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا احمد ۔۔۔ پہاڑ پر نظر آیا تھا راستہ مجھ کو

خواب اگر اپنی تعبیر پر قناعت کر لے تو جستجو کا دم گھٹ جاتا ہے اور زندگی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح دریا سے جوہڑ میں آ جاتی ہے۔ مگر احمد حسین مجاہد کہیں رکتا نظر نہیں آتا، اس کے خواب کا سفر دریا بہ دریا جو بجو رواں دواں ہے؛

میں جس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک زمانے سے ۔۔۔ کہیں وہ مل ہی نہ جائے یہ احتمال عذاب

شاعر کا یہی توانا اور پُر امید لہجہ جب اجتماعی زندگی سے جڑتا ہے تو معاشرے میں تبدیلی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ فصلیں لہلہاتی ہے اور خوشحالی کے وہ خواب جنم لیتے ہیں جنہیں دیکھنا انسان کی ضرورت بھی ہے۔

☆☆☆

☆ ساری اردو دنیا میں ''دھند میں لپٹا جنگل'' توجہ سے پڑھی جائے گی کہ یہ ایک بشارت سنانے والے اور تازہ تر امکانات کے دروازے پر دستک دینے والے شاعر کی ترجمانی کرتی ہے۔

افتخار عارف

شبہ طراز (لاہور)

احمد حسین مجاہد

لفظ کی دریافت سے بازیافت تک

انسان دنیا میں آتا ہے تو محض ایک جان دار کے روپ میں، جسے صرف بروقت خوراک اور موسموں کے تغیراتی مدوجزر سے پناہ چاہیے ہوتی ہے، اور اپنی ان دو جبلتوں کا اظہار وہ ان ضروریاتِ زندگی کے انتہائی مطلوب لمحوں میں رو کر کرتا ہے۔۔۔چیختا ہے، چلاتا ہے، اس لئے کہ وہ اس وقت "لفظ" سے ناآشنا ہوتا ہے، اپنے جذبات اور احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کا ہنر نہیں جانتا اسی لئے ضرورت پوری ہوتے ہی خوابوں کے اُن مرمریں، حسین جزیروں میں کھو جاتا ہے جن کی خوب صورتی شعور کی حدوں میں داخل ہونے کے بعد بھی کہیں لاشعور کی نہاں ترین تہوں میں خوابیدہ رہ جاتی ہے۔ اور پھر جنہیں "لفظ" سے محبت ودیعت ہوتی ہے اُن کے تخیل میں لفظوں کے تاج محل بننے لگتے ہیں۔ شعور کی پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر وہ لفظ کی محبت میں مبہوت ہو جاتے ہیں کہ وہ جان جاتے ہیں کہ لفظ ہی وہ ذریعہ ہیں جو گھرے بیٹھے جذبات کا اظہار کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ فکر کے کسی ایسے ہی موڑ پر پہنچ کر احمد حسین مجاہد نے اقرار کیا

کن اچھوتے راستوں پر فکر ہے گرمِ سفر لفظ ہیں سب محوِ حیرت، رنگ ہیں بکھرے ہوئے

اور یوں ایک شاعر کا۔۔۔ایک احمد حسین مجاہد کا شعری سفر آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں "لفظ" رنگِ غزل بنے اور احساس تصویرِ غزل ہونے کے مراحل میں دریافت کے پہلے پہلے قدم اٹھانے کو تیار ہوئے۔ احساسات کی نوکیلی، کٹیلی کرنیں آئینۂ دل پر پڑنے لگیں۔ یہاں سے مجاہد نے لفظ کو کھوجنا شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہر سچے لفظ میں اپنا عکس پایا تو کہا

جذبوں کے ابلاغ میں سچا لفظ ہوں میں بھید بھری آنکھوں سے گہرا لفظ ہوں میں

بھید بھری آنکھوں کی گہرائی ناپنے کے لئے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔ کائنات کی سچائیوں، حقیقتوں سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے، زمینی فاصلوں کو آسمانی راستوں میں بدلنا پڑتا ہے، موسموں کی صعوبتیں سہنی پڑتی ہیں، عشق سمندر میں ڈوبنا ابھرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر جذبوں کو لفظوں کی مزین و مرصع پوشاک مہیا ہوتی ہے۔ یہ

تبھی ہوتا ہے جب کسی کے چاروں طرف عشق کی آب و ہوا میسر ہو اور اس کا وجود بھی اسی سرشاری کی کیفیت کا ادراک کرے۔ بے شک احمد حسین مجاہد نے اپنے مشاہدات کو اتنا گراں مایہ محسوس نہیں کیا اور کہہ اٹھے

نا معتبر حوالہ ہیں میرے مشاہدات ۔۔۔ دیکھی ہے میں نے روزنِ زنداں سے کائنات

پھر بھی وہ اپنے ارد گرد ایک حقیقی عشق کی فضا بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہے اور کہتے رہے

ہر لفظ کو نوید بقائے دوام کی ۔۔۔ میرے سخن کی آب و ہوا عشق سے ہوئی

یہاں وہ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ، کہ انسانی حسیات محدود ہیں اور جو ہے، اسے دیکھنے کے لئے آنکھ ناکافی سہارا ہے، اپنے مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں اور تمام تر مزاحمتوں کے باوجود احمد حسین مجاہد لفظوں کی حرمت کا بھرم قائم رکھنے میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ کیسے کیسے دھوکے، کیسے کیسے رویے، کیسے کیسے نشیب و فراز زندگی میں پائے لیکن وہ کہتے رہے

میں کیسے کسی لفظ کی توہین کروں ۔۔۔ رکھنا ہے ہر اک شعر کا پندار مجھے

یہاں جو بات قاری کے ذہن میں احمد کا قد کاٹھ بلند کرتی ہے وہ ''لفظ'' سے ان کی محبت، ''لفظ'' پر ان کا اعتماد، ''لفظ'' کا ان پر احسان اور پھر ان سب کے ساتھ ''لفظوں'' پر ان کی دسترس ہے۔ لکھنا، لکھے جانا، گفتگو کرنا، پڑھنا، کسی کا ان کو پڑھنا، جیسی تمام وارداتیں لاشعوری طور پر احمد کی نظموں اور غزلوں میں در آئی ہیں، مثلاً

''میرے ہاتھ کی پشت پر/نرم ہونٹوں سے کوئی/محبت سے اک فیصلہ لکھ رہا ہے'' (پابہ گِل)

یا۔۔۔ ''مجھے قدرت نے لفظوں کو برتنے کا ہنر بھی/بخش رکھا ہے'' (ابلاغ)

اسی طرح بلند پایہ نسائی شاعری کی پہچان، پروین شاکر کے لئے ایک نظم میں کہتے ہیں

''قضا تازہ غزل میں/اک اچھوتے لفظ ہی کو/قافیہ کرنے کے در پے تھی''

ایک اور نظم کا ٹکڑا دیکھیے

''اب تمہیں احساس ہوگا/کرب کیا ہے/کرب کا احساس کیا ہے/میں تو ان لفظوں سے پہلے ہی بہت مایوس تھا''

(A Touch of Poetry)

ایسے ہی ذات کو کسی گفتگو کا حصہ بنانے اور خود کو کسی کی گفتگو کا حصہ بنے دیکھنے کی خواہش ان شعروں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے

اک عذاب ہوتی ہے، رمزِ آشنائی بھی ۔۔۔ مجھ سے میری تنہائی گفتگو بھی کرتی ہے

اور۔۔۔ اک وہم سے میں نکلوں اک راہ وہ چل دیکھے

میں اس کو پڑھوں احمدؔ وہ میری غزل دیکھے

لفظوں میں اپنے حساس لمحے ڈھالنے والا شاعر، شعروں اور نظموں کے آئینہ خانوں میں اپنے لہجوں کو

عکس کرتے ، انگلیاں فگار کر لینے والا تخلیق کار ، لفظ کی پہچان رکھنے والا لکھاری ، لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھنے والا انسان ، لفظ کے حساس ترازو میں رویوں کو تولنے والا منصف ، اور لفظ کو ایمانداری سے برتنے والا فن کار ہی دراصل ''لفظ'' کا غم خوار اور قدر دان ہوتا ہے ۔ لفظ انسان کی ذات کی پہچان کرواتا ہے ، یہی لفظ انسان کے شعور اور ادراک کی پہچان کرواتا ہے ۔ لفظ ہی کسی انسان کا خارج کی دنیا سے رشتہ جوڑتا ہے ۔ لفظ زبان سے ادا ہوتا ہے اور شخصیت دوسروں پر افشا ہو جاتی ہے ، کہ تمام بڑے بڑے مفکرین کا قول ہے کہ انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہے ۔ کسی بھی انسان کی لاشعوری انفعالیات اس کے فن میں جھلکتی ہے ۔ دیکھنے سننے اور پڑھنے والے فن کار کی تخلیق سے ہی اس کی دلی کیفیات اور سوچ کے دھاروں کا اندازہ لگا لیتے ہیں ، اور بڑا انسان وہی ہوتا ہے جو کائنات کی خوابیدہ قوتوں ، مخفی حقیقتوں اور ظاہری حسن و جمال پر غور و فکر کرتا ہو ، جس کی سوچ ، جس کا تخیل ، جس کا لا شعور انسان کی ارفع ترین صورت حال کی غمازی کرتا ہو ۔ اور ارفع و اعلیٰ کی تعریف میں یہ بات ہی بڑی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے ۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں ہمیں کائنات کے متعلق ایک ارفع سوچ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ، حسن و عشق کی وارداتوں کا سراغ بھی ملتا ہے ۔ ہجر و وصال کے ذائقے بھی محسوس ہوتے ہیں اور لا حاصلی اور تنہائی کا دکھ بھی زخمی کرتا ہے لیکن کہیں بھی لفظوں کے شتر ، بے کجاوہ اور بے مہار نہیں ہوتے ۔ روایتی غزل گوئی اور جدید تمثالئے بین بین چلتے ہوئے ایک نئی تہذیب کو جنم دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ وہ تہذیب ، جس کی جاگیر خوب صورت تشبیہیں ، نادر ردیف قافیے ، غیر معمولی بحریں ، نئی نکور ترکیبیں اور شاندار الفاظ ہیں ۔

اس مقام پر پہنچ کر احمد حسین مجاہد کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ لفظ آغاز شعور میں تو اظہار ذات کے لئے سامان لذت فراہم کرتے رہے ہیں ۔ انسان کو کہہ دینے یا لکھ دینے سے جو ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب میسر آتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں ، لیکن جب انسان حوادث کی بھٹی میں تپتا ہے ، جب اسے زمانے کے سرد و گرم کی ہوا لگتی ہے ، جب اسے جھوٹے ''لفظ'' دھوکہ دیتے ہیں اور جب وہ لفظوں کی بازی گری کا شکار ہوتا ہے اور لفظ کی ستم ظریفی سے گھائل ہوتا ہے تب اچانک اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ لفظوں کا سرمایا تو دراصل اسے دکھوں کو محسوس کرنے کی اعلیٰ ترین سطح پر لے آیا ہے جہاں سے واپسی کے راستے مفقود ہیں ۔ ایسے ہی کسی مقام پر احمد حسین مجاہد کہہ اٹھتے ہیں ،

مجھ کو زعم تھا لفظ مرا سرمایا ہیں لیکن لفظ تو جاں لیوا بیماری نکلے

اور لفظوں کے اس رنگا رنگ ، سجے سجائے میلے میں غزلیں کہتے ، نظمیں لکھتے احمد حسین مجاہد کو اپنی ذات کے ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور نہ ہونے کے کرب کا ادراک بھی ہوتا ہے ، دوسری طرف ان کی غزلوں میں رومان پرور فضا کی رو میں پُر اثر شعر بھی قاری کے ذہن و دل پر پیار کی من من بوندیں برساتے ہیں ۔ سوچ اور تخیل کی اس انتہا پر جب کوئی فن کار اپنی شعوری فکر کی رو میں بہتا ، یہ گیان حاصل کر لیتا ہے کہ وہ اس

کائنات کے پھیلاؤ میں اس ایک قطرہ ہے جو کسی بھی لمحے دریا میں مل کر بے وجود ہونے والا ہے تاہم یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اس کو ایک نیا وجود ملتا ہے۔ جب وہ اپنی اور "لفظ" کی بازیافت کرتا ہے۔ جب وہ قطرے سے گہرائی کے دریا میں ملتا ہے اور دریا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سوچ کا دائرہ کائنات کو محیط کر لیتا ہے۔۔۔۔ تب۔۔۔ زندگی اسے "معنی میں لپٹا جنگل" دکھائی دیتی ہے جس کی دریافت میں وہ لفظ لفظ اپنی نظموں اور غزلوں میں ڈوبتا ابھرتا ہے۔۔۔!

اور کائنات کے اس عمر بے کراں میں ڈوبتے ابھرتے احمد حسین مجاہد اس بے ثباتی اور فنا کے کرب کو جھیلتے نظر آتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ وقت کی تختی پر نام لکھے جاتے ہیں پھر کوئی موجِ عمرِ رواں ان ناموں کو اچھال کر عدم آباد کرتی ہے اور زندگی کے منظر نامے پر نئے نام جگہ پاتے ہیں۔۔۔ وہ اس قانونِ فطرت کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔۔۔ ان کے نزدیک زندگی "لفظ" کے کسی احساس سے آغاز ہوتی ہے اور "لفظ" ہی پر کوئی خوب صورت اختتام ہوتا ہے۔ اس کا اظہار اس شعر میں دیکھیے

عبارتوں میں نئے لفظ روح پھونکیں گے　　　میں حاشیے سے بھی ہو جاؤں گا حذف سا ئیں

اس عجز و انکساری کی منزل پر بے شک احمد حسین مجاہد دنیا کے بہت جلد بھول جانے والے رویے پر بحث کر رہے ہیں لیکن انہیں یقین ہونا چاہیے کہ لفظ کو خلوصِ دل و خلوصِ نیت کے ساتھ برتنے والے اتنی آسانی سے منظر نامے سے غائب نہیں ہوتے، اور ابھی تو ان کا شعری سفر راستوں میں ہے، ابھی تو وہ قرطاس و قلم کے عروج کی دنیا میں ہیں اور وہ اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہے تو عنوان، مضمون اور حاشیہ سب پر چھا جائیں گے۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

احمد حسین مجاہد غزل کا ایک خوش فکر شاعر ہے۔ ندرت کا متلاشی اور خلوص کا خواہاں ہے۔ اُس کے ہاں تازہ خیال کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہنے کا رویہ ملتا ہے، جس نے اُس کی غزل میں ایک خوش گواریت کو قائم رکھا ہے۔ غزل میں اُس نے 'عشق' پر اپنی اساس رکھی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہم و گماں کے چنگل سے عشق ہی رہائی دلا سکتا ہے۔ عشق جو اذانِ بلال میں جھلکتا ہے اور عشق جو خلقِ خدا کو مطیع کر لیتا ہے۔ مجاہد نے اپنے سخن کی آب و ہوا میں بیشتر عشق ہی کے رنگ و بُو سے استفادہ کیا ہے۔ بالائی علاقوں کی نمائندگی کرنے والے اس نوجوان شاعر کے پاس چٹانوں کو کاٹتے ہوئے جھرنے کی سی شدت ہے جس کی تہذیب سے وہ پتھروں کو تراش لینے کے فن سے آشنا ہو سکتا ہے۔

خاور اعجاز (ملتان)

چند تاثرات

☆ آپ نے آج کے مسائلِ حیات کو جس طرح تغزل کے شیرے میں گوندھ لیا ہے، وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆ احمد حسین مجاہد کی شاعری یادِ شمال کی چھپتی ہوئی ترجیتوں سے جوان ہونے والے کے دکھوں کا ثمرہ ہے۔ تحقیق شاخ کے پتوں کی گنگناہٹوں سے حرمینِ غزل سدرہ و نظارہ کی سرخیوں سے خوش بدنی لے کر آ موجود ہونے والی تھم، اس کی شدتِ احساس کی ہمواہوتی دیکھی جاتی ہے۔ مجاہد تغزل کے آثار جمع کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کی شاعری یادوں کی تخت گری میں اتنی ہوئی بدلی ہے جو برس پڑے گی تو صحتِ وجود کو تھپیڑے بھی لگائے گی اور بوسے بھی دے گی۔

آصف ثاقب

☆ آپ کے ہاں فطرت سے وابستگی اور محبت وافر ہے۔ یہ دونوں ہمہ گیر جذبے اچھی شاعری کے بنیادی جوہر ہیں۔

نصیر احمد ناصر

☆ احمد حسین مجاہد منفرد لہجے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری ریاض کے مرحلوں سے گزری ہے اسی لیے نکھری ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صابر کلوروی

☆ احمد حسین مجاہد توازن و اعتدال کا شاعر ہے اور صاحبانِ بصیرت پر اس کے چراغِ سخن کی جھلمل جھلمل کرتی کرنیں واضح ہیں۔

ڈاکٹر رؤف امیر

☆ احمد حسین مجاہد بیسویں صدی کے آخری عشرے کے ان صاحبِ توفیق غزل نگاروں میں سے ایک ہے جن کے فن کی تازگی اور روشنی میں اکیسویں صدی کی اردو غزل اپنی سیاقی مسافت کے اگلے پڑاؤ کے لیے رختِ سفر باندھے گی۔

ڈاکٹر افتخار مغل

☆ احمد حسین مجاہد کی شاعری پُراسرار و رومان پرور فضاؤں کی ایسی نادر تمثالوں پر مشتمل ہے جہاں حقیقت، تخیل، بصیرت اور وجدان لحہ بہ لحہ باطنی کیفیات کی مصوری کرتے نظر آتے ہیں۔

عامر سہیل

☆ بے ساختگی اور خلوص جہاں احمد حسین مجاہد کی تحریر اور شعر کے بنیادی عناصر ہیں۔ مجاہد ایک شاندار ادبی ماضی رکھتا ہے اور اس حوالے سے اس کا مستقبل بھی تابناک ہے۔

خالد خواجہ

احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)

ہُوں کہ جب تک ہے کسی نے معتبر رکھا ہوا
ورنہ وہ ہے باندھ کر رختِ سفر رکھا ہوا
مجھ کو میرے سب شہیدوں کے تقدس کی قسم
ایک مدت ہے مجھے شانوں پہ سر رکھا ہوا
میرے بوجھل پاؤں گھنگھرو باندھ کر ہلکے ہُوئے
سوچنے سے کیا نکلتا دل میں ڈر رکھا ہوا
اک نئی منزل کی دُھن میں دفعتا سرکا لیا
اُس نے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھا ہوا
تُو ہی دنیا کو سمجھ پروردۂ دنیا ہے تُو
میں یونہی اچھا ہُوں سب سے بے خبر رکھا ہوا

☆

گزر رہی ہے جو مجھ پر بتا کے لے آئے
کوئی نہیں ہے جو اُس کو منا کے لے آئے
گزارنی تھی کڑی شب سو اُس گلی سے ہم
چراغِ نقشِ کفِ پا اٹھا کے لے آئے
مگر یہ ہم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ
وہاں سے رُاکھ تو اب کوئی جا کے لے آئے
وہ اپنی کار گزاری کی داد چاہتے ہیں
جو عاجزی میں قرینے ریا کے لے آئے
بس اک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمد
اُسے بھی سامنے ہم خود ہَوا کے لے آئے

☆

احمد حسین مجاہد

پہاڑ پر مجھے رستہ دکھائی دیتا ہے
کئی دنوں سے وہ تنہا دکھائی دیتا ہے
اتارتا ہوں میں تصویر اُس کی لفظوں میں
مجھے خیال کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
فرازِ کوہ سے جب دیکھتا ہُوں بستی کو
تو اُس کا گھر بھی قفس سا دکھائی دیتا ہے
زباں سمجھتا ہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی
یہ شہر مجھ کو اجڑتا دکھائی دیتا ہے
برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چاند اترا ہے
مجھے یہ وقت دعا کا دکھائی دیتا ہے
یہ کس دیار کی مٹی مرے خمیر میں ہے
کہ جسم روح سے ہلکا دکھائی دیتا ہے

☆

سرِ آئینہ، ہر ذرہ، صحرا چمکتا ہے
تری پلکوں کا سایہ سا سراب آسا چمکتا ہے
جھٹک کر ڈالتی ہے جب وہ بھیگے بال شانے پر
تو نیچے دُور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے
کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹی کو
بدن کے ریشے ریشے میں اک آئینہ چمکتا ہے
یہاں سے کوئی گزرا ہے یقینا مجھ سے پہلے بھی
درِ امکاں پہ اب بھی شبنمی بوسہ چمکتا ہے
جب آنکھیں خاک ہو جاتی ہیں احمد تب کہیں جا کر
بس اک پل موجہ، خوشبو کا نقشِ پا چمکتا ہے

احمد حسین مجاہد

اپنی تخلیق سے کچھ داد تو پائی ہوتی
صفحہ ٔ خاک پہ تصویر بنائی ہوتی

میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات
اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہوتی

چار سُو بکھری یہ آیات تلاوت کرتا
دشت و کہسار کے مکتب میں پڑھائی ہوتی

لے گیا کوئی رسالت، کوئی اعجازِ ہنر
میں نے اے کاش اگر آگ ہی لائی ہوتی

جز ترے اور کو میں دل میں جو آنے دیتا
اُس نے اِس دشت میں دیوار اٹھائی ہوتی

میں کسی گم شدہ دریا پہ کھڑا ہوں احمد
موج ورنہ مرے سر تک کوئی آئی ہوتی

☆

کوئی خواب میرے وجود میں کہیں ریزہ ریزہ بکھر گیا
مرے ہاتھ کچھ نہ لگا مگر، مرے سر سے بوجھ اتر گیا

وہی پاؤں چومے تھے جو کبھی، میں نے اضطراب و وصال میں
وہی پاؤں جاتے ہوئے کوئی، مرے دل پہ رکھ کے گزر گیا

مجھے لینا دینا تو کچھ نہ تھا، مری بے کلی یونہی رات کو
مجھے اُس گلی میں جو لے گئی، میں گلی سے ہو کے گزر گیا

☆

بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے
یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا

☆

احمد حسین مجاہد

دشت تھا، دھوپ تھی، وہ یاد بھی آیا ہُوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ میں انت مچایا ہُوا تھا

خواب، مٹی کا دیا، نام، مقام اور کلام
اُس کے قدموں میں رکھا جو بھی کمایا ہُوا تھا

میری ناکام محبت تھی وہ لیکن اُس نے
مجھ کو مرنے سے بہر حال بچایا ہُوا تھا

چُپ لگی ایسی کہ پوچھا بھی تو بولا نہ گیا
ابتدا میں تو بہت شور مچایا ہُوا تھا

کچھ تو اظہار محبت بھی مرا سرسری تھا
کچھ وہ بے درد بھی انکار پہ آیا ہُوا تھا

اُس نے کچھ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا
میرا سایہ بھی پسینے میں نہایا ہُوا تھا

مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اُس نے
میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہُوا تھا

☆

خود رو تھا دلوں میں کھل گیا تھا
میرا بھی عجیب سلسلہ تھا

کھڑکی پہ جھکی ہوئی تھیں بیلیں
کمرے میں کوئی معاملہ تھا

پتھر میں دراڑ آ رہی تھی
یا مجھ سے کسی نے کچھ کہا تھا

تُو اور کہیں سے آ رہی تھی
میں اور کہیں گیا ہُوا تھا

☆

احمد حسین مجاہد

آسمانوں سے فرشتہ تو نہیں اترے گا
شعر اتریں گے،صحیفہ تو نہیں اترے گا
پار جانا ہے تو دریا میں اترنا ہو گا
سوچتے رہنے سے دریا تو نہیں اترے گا
بات بے بات نہ یاد آئے خدوخال سمیت
وہ مرے دل سے کچھ ایسا تو نہیں اترے گا
کتبِ عشق سے تحصیلِ جنوں کرتا ہوں
میرے شانے سے یہ بستہ تو نہیں اترے گا
ہو گئے صبح کے آثار ہویدا بھی تو کیا
اس قفس میں کوئی زینہ تو نہیں اترے گا
غم کے اظہار میں کیا چیز ہے مانع احمد
سر ہی اترے گا، یہ نشہ تو نہیں اترے گا

☆

میں گھر سے دُور تھا ، تنہا تھا، بے سہارا تھا
مجھے کسی نے بہت دُور سے پکارا تھا
بہت بھلی تھی وُہ شاخوں سے پھوٹتی ہوئی لَو
شجر کی اوٹ میں شاید کوئی ستارا تھا
زمیں پہ اترا جب انسان تو مرے رب نے
کتاب بعد میں پہلے دیا اتارا تھا
یہ خشک چشمہ ،یہ ٹوٹے مکاں،یہ اجڑا دیار
اسی جگہ پہ کبھی گھونسلہ ہمارا تھا
نمازِ عصر پڑھی تھی مکاں کے ملبے پر
تلاوتِ غمِ انساں میں دن گزارا تھا

احمد حسین مجاہد

تجھ حسن سے معاملہ کس آن میں ہُوا
میں تُو جواں ہی میر کے دیوان میں ہُوا
میری متاعِ اول و آخر ہے میرا عشق
وُہ عشق جو کہ عشق کے امکان میں ہُوا
سر پر بنا لیا ہے پرندے نے گھونسلہ
غافل میں خود سے ایسا ترے دھیان میں ہُوا
اُس کو طرح ملی مرے فکر و شعور سے
جو فیصلہ بھی وقت کے ایوان میں ہُوا
میں دکھ تھا کائنات کا جب حد سے بڑھ گیا
میرا ظہورِ صورتِ انسان میں ہُوا

☆

وقت کی رفتار ہو جاؤں گا میں
اتنا پُر اَسرار ہو جاؤں گا میں
جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی
جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں
بے نیازانہ گزر جائے گا تو
گاؤں کا بازار ہو جاؤں گا میں
دیر سے چشمِ شفق آسا میں تھا
اب سرِ رخسار ہو جاؤں گا میں
دیکھنا ڈھونڈے گی جب منزل مجھے
راہ کی دیوار ہو جاؤں گا میں

☆

احمد حسین مجاہد

CHILD LABOUR

مرے بابا نہیں ہیں ناں۔۔!
میں تپتی دوپہر میں
شہر کی سڑکوں پہ اپنے جسم کا
ایندھن جلاتا ہوں
تو گھر میں چولہا جلتا ہے
مرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں
پاؤں سے چپکی ہوئی یہ تارکول ریت
میرے ساتھ روزانہ مرے بستر میں جاتی ہے
مجھے اپنے بدن سے
شہر کی روندی ہوئی سڑکوں کی
میلی باس آتی ہے
مرے بابا نہیں ہیں ناں۔۔۔!

خدا نہیں آ رہا

پھر اک دن
اس غبار آلود رستے سے رکوئی درویش آئے گا
وہ بستی کے کناروں پر کھڑی
خلقِ خدا کو گودڑی میں بھر کے
بستی کے چوراہے میں انڈیلے گا
دلوں کو چیرتا بے نُور سناٹا
پھٹی آنکھوں سے اُس کی سمت دیکھے گا
فضا میں جا چکے اُن قافلوں کی گرد ہو گی
جن کا کارِ منصبی ایسے گئے گزرے علاقوں میں
کہیں خیمے، کہیں گندم، کہیں کمبل
کہیں بے حوصلوں میں حوصلہ تقسیم کرنا ہے
مگر کب تک؟ رکہ اب خلقِ خدا اک بار پھر
اپنے خدا کی منتظر ہے

دوسرے دیسوں سے آئے قافلے
کب تک بروئے کار آئیں گے؟
چٹختی پسلیوں کے روزنوں سے
بھوک باہر جھانکتی ہو گی رکئی اک ڈولتے پنجر
سرک کر گودڑی کے سائے میں
درویش کے پیروں سے لگ کر پوچھتے ہوں گے
خدا کب آئے گا؟
صدیوں سے ہم اپنے خدا کی رراہ تکتے ہیں
تو پھر درویش لاٹھی کے سہارے راُٹھ کھڑا ہو گا
کہے گا
’’میں تمہارے نام اک پیغام لایا ہوں خدا کا
خالقِ کون و مکاں یہ کہہ رہا ہے
چھوڑ دو یہ سہل انگاری
اٹھاؤ کسیں، کدالیں، بیلچے اپنے
سنو۔۔۔! افلاک سے کوئی نہ اترے گا۔‘‘

احمد حسین مجاہد

GUILTY LOVE

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
رگوں میں دوڑتی وحشت بھی کانپ اٹھتی ہے
یہ مرحلہ جو محبت میں ہے مجھے درپیش
اک ابتلا ہے اور اِس کا بیان سہل نہیں
بس اک خدا ہی مرا چارہ ساز ہے لیکن'
خدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے

وُہ حسن جس کے تقدس سے شرمسار تھا عشق
اب اُس کی آنچ مرے دل کو گدگداتی ہے
بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ ناکردہ
اک آگ سی مرے سینے میں لہلہاتی ہے
مجھے خود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے
خود اپنے ڈر سے مری سانس پھول جاتی ہے
بس ایک بار دھڑکتا ہے بے طرح مرا دل
اور اس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے

گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
خدا سے کیسے کہوں، بات ہی کچھ ایسی ہے

ٹوٹی چوڑیاں

بہت کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا
مگر پھر بھی
کوئی ٹوٹی ہُوئی چوڑی
کہیں سے مل ہی جاتی ہے
کبھی تکیے کے نیچے سے
کبھی بک شیلف سے
جیبوں سے
البم سے

تو پھر وُہ پوچھتی ہے
تم سے ملنے کون آیا تھا
یہ کس کی چوڑیوں سے تم
مرے جیون کو گھائل کر رہے ہو
کون ہے وُہ؟
میں اسے کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہُوگا
مگر ٹوٹی ہُوئی یہ چوڑیاں---

احمد حسین مجاہد

ناجنس کا لمس

وہ جتنی
تو اس کے دوپٹے پہ
کاڑھے ہوئے پھول
اک ایک کر کے
فضا میں بکھرتے
نئی کونپلیں پھوٹتیں
پھول کھلتے
فضا میں بکھرتے
کوئی پھول جب اپنے ناجنس کا لمس پاتا
تو شعلہ بھڑکتا
کبھی آئینوں سے
کبھی پانیوں سے
بجھی ہوئی راکھ اڑتی
تماشائی سب دیکھتے
دیکھتے اور رستہ بدلتے
مگر میں ۔۔۔۔
مجھے ان پراسرار پھولوں کی
مانوس خوشبو نے
کچھ ایسا پاگل کیا
میں فضاؤں میں اڑتے ہوئے پھول چنتا رہا
پھول چنتا رہا
مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہانی مری
یہ مرے ہاتھ دیکھو۔۔۔!
مرے ہاتھ ایسے کبھی تھے۔۔۔؟؟

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵

پانی تھا میسر نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

JADEED ADAB Literary Urdu Journal (January To June 2009)

Haider Qureshi Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.



احمد حسین مجاہد

دو گوشے
اندر کے
صفحات
میں مطالعہ
فرمائیں!



ڈاکٹر مظفر حنفی